بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہمارے اس عہد کا کونسا ایسا شخص ہے جو علوم طبیعی کے انکشافات اور کمالات اور اُن کے اثرات سے ناواقف ہو۔ ہر انسان اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ان ایجادات نے انسان کے مادی آرام و آسائش میں بے حد اضافہ کیا ہے۔ طریقۂ پیدائش میں نئی نئی گرہیں کھلنے سے انسان کو فراوانی میسر آئی ہے۔ سمندر کے اندر جانے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموج اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا ایلچی بنانے اور خود بخود بجنے والے باجوں اور ہوش ربا سرعت سے چلنے والی سواریوں کے کرشموں نے انسانی زندگی کو بے حد قوت عطا کی ہے اور اسی کی مدد سے اُس نے حیرت انگیز کام سرانجام دیئے ہیں۔

سائنس کی ان ایجادات کے اثرات صرف مادی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ ان سے انسان کی حیاتِ اجتماعی بھی شدید طور پر متاثر ہوئی ہے۔ وہ لوگ جو اس دنیا میں نظام اسلامی برپا کرنا چاہتے ہیں اُن کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ حالات کے ان غیر معمولی تغیرات کو پوری طرح ذہن میں رکھ کر اقدام کریں۔ ان صفحات میں یہ ممکن نہیں کہ ہم ان سارے تغیرات کا تفصیلی جائزہ لیں۔ یہاں ہم صرف چند امور کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

دورِ جدید کے انسان کے لیے نتائج کے اعتبار سے سب سے اہم ایجاد بھاپ کے دیو کی تسخیر ہے۔ اُس نے جس روز سے اس سے کام لینا شروع کیا ہے، اُسی دن سے اُس کے سامنے لاتعداد مسائل پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کثیر پیداواری اور زود پیداواری نے، جو اس دیو کی خدمت کے بالکل قدرتی نتائج ہیں، دُنیا میں بے روزگاری، استعماریت، خون ریزی، سفاکی، بے حسی اور طبقاتی تقسیم کو جنم دیا ہے۔ پھر برق آسا ذرائع رسل و رسائل نے زمان و مکان کی حد بندیاں دور کر کے پوری دنیا کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بنا دیا ہے۔ اب نہ صرف کرہ ارضی کے دُور دراز گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب آگئے ہیں

بلکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبے بھی ایک دوسرے میں اس طرح تحلیل ہو گئے ہیں کہ ہم ان کے درمیان کوئی حد امتیاز نہیں کھینچ سکتے۔ حیاتِ انسانی میں یہ اتنا عظیم تغیر ہے کہ اس نے زندگی کے سارے پہلوؤں پر نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

آپ اگر صنعتی انقلاب سے پہلے کی اجتماعی زندگی کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حیاتِ انسانی مختلف اکائیوں میں بکھری پڑی تھی۔ ان اکائیوں میں ممکن ہے بہت سی چیزیں مشترک بھی ہوں اور وقت کے تہذیبی اثرات کی پرچھائیں بھی پڑتی ہوں لیکن ان مختلف اکائیوں میں رہنے والے لوگ نہ تو فکر و نظر کے اعتبار سے بالکل ایک دوسرے کے ہم آہنگ تھے اور نہ تمدن و معاشرت میں ہم رنگ۔ لیکن جس دن سے ذرائع رسل و رسائل نے دنیا کے مختلف حصوں کی طنابیں کھینچ کر انھیں ایک دوسرے کے بالکل نزدیک کر دیا ہے، اُسی دن سے انسان کے لئے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ اپنی تہذیبی اقدار کو غالب قوتوں کی دست برد سے بچا کر رکھے۔ یہ قوتیں سیلِ بے پناہ کی طرح جب اُمڈ پڑتی ہیں تو پھر کوئی جگہ ان کی زد سے محفوظ نہیں رہتی۔ گھر، بازار، دربار و ایوان، ثقافتی اور معاشرتی ادارے، غرض زندگی کے سارے شعبے اس کی لپیٹ میں یکساں طور پر آجاتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہتا جو ہزار سعی کے باوجود اپنے آپ کو اس کے حوالے نہ کر دے۔ چنانچہ وہ قومیں جن کے ہاں رنگ و نسل کا امتیاز دین و ایمان کا ایک ضروری جزو سمجھا جاتا ہے، وہ بھی فکر و نظر کی کسی اساسی تبدیلی کے بغیر محض حالات کے ہاتھوں اسے ترک کر دینے پر مجبور ہوئی ہیں۔ یہی حال آداب و اطوار، آرائش و زیبائش اور طرزِ بود و ماند کا ہے۔ زندگی کے جن طور طریقوں کو عروج حاصل ہوتا ہے وہ بڑی ہی سرعت کے ساتھ دوسرے لوگوں میں پھیلنے شروع ہو جاتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو ان کی راہ روک سکے۔

اسی طرح معاشی میدان میں بھی ایک زبردست تغیر رونما ہوا ہے۔ ذرائع آمد و رفت نے صرف دنیا کے مختلف ممالک کو ہی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ملا دیا، بلکہ ہر شہر اور ہر قریہ کو پوری دنیا کے ساتھ

اس طرح جوڑ دیا ہے کہ اب اُس کا کسی طرح بھی اُس سے الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں رہا۔ اس تبدیلی کے بعد اب اگر کوئی قوم یہ سمجھتی ہے کہ وہ کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر وقت کے بُرے اثرات سے اپنے آپ کو بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ جنت الحمقا میں بستی ہے۔ ایک ملک خواہ اپنے لیے کسی نظامِ معیشت کو پسند کرے لیکن وہ اس بات کے لیے بالکل مجبور ہوتا ہے کہ وقت کے معاشی تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ وہ اپنے دلپسند نظامِ معیشت کو اس وقت تک اپنا نہیں سکتا جبتک کہ اس کے پاس میں ساری دنیا سے لڑ جانے کی طاقت پیدا نہ کرے اور بالآخر دنیا کے رجحانات کو بدل کر اسے دنیا کی ایک غالب قوت بنا کر نہ رکھ دے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں اگر کوئی اللہ کا بندہ رزقِ حلال کا لقمہ مُنہ میں ڈالنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو تو اُس کو پوری دنیا کے ساتھ جنگ آزما ہونا پڑے گا۔

حالات اور فکر و نظر کی اسی تبدیلی کے نتیجہ میں اب دنیا کی ساری حکومتوں نے عدم مداخلت (LAIZZEZ - FAIRE) کی پالیسی کو ترک کر کے معاشی میدان میں پوری طرح دخل دینا شروع کر دیا ہے۔ اس دور میں کوئی حکومت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ معیشت کے معاملہ میں ایک خاموش اور بے تعلق تماشائی بن کر بیٹھی رہے اور اگر وہ ایسا کرنے کی حماقت کرے گی تو خود اپنے ہاتھ سے اپنی قبر کھود دے گی۔ چنانچہ دیکھیے کہ اب ہر حکومت درآمد و برآمد پر پورا پورا کنٹرول رکھتی ہے، کارخانوں کی ترقی و توسیع میں، پیداوار کو بڑھانے اور گھٹانے میں اسے مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ملک کی ساری معیشت پر اُس کا پوری طرح قبضہ ہوتا ہے۔ وہ جس طرح چاہتی ہے اسے نشو و نما دیتی ہے اور جن سانچوں میں چاہتی ہے ڈھال دیتی ہے۔ اور اگر وہ اس کا التزام نہ کرے تو نہ صرف اُس کا اپنا وجود معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے، بلکہ پوری ملکی معیشت میں ایک زبردست اختلال اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

معاملہ پھر محض مداخلت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ دنیا کے سارے ممالک نے اب منصوبہ بندی

کو راہنما اصول کے طور پر تسلیم کر کے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ ممالک جو براہِ راست اشتمالیت کی زد میں ہیں ان میں تو اس منصوبہ بندی نے ایک شدید جکڑ بندی (REGIMENTATION) کی صورت اختیار کر لی ہے، لیکن جو قومیں آزاد معیشت کی علمبردار ہیں وہ بھی اب اس بات پر مجبور ہو چکی ہیں کہ پیداواری قوتوں کے درمیان تطابق و توافق پیدا کرنے کے لیے اُن کی منصوبہ بندی کی جائے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے ایک طرف تو حکومت کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہوا ہے اور دوسری طرف اُس کے ہاتھ میں اتنی زبردست قوت آگئی ہے کہ کوئی براہِ راست اقدام کیے بغیر وہ زندگی کی گاڑی کو جس رُخ چاہے بڑی آسانی سے موڑ سکتی ہے۔ ہماری زندگی میں معیشت کو جو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اُس سے ہر شخص پوری طرح آگاہ ہے۔ اس شعبۂ حیات کی صورت گری کرنے اور اسے اپنے منصوبے کے مطابق چلانے کے اختیارات جس قوتِ قاہرہ کو حاصل ہوں اس کی اثر آفرینیوں کا صحیح طور پر وہی آدمی اندازہ لگا سکتا ہے جس نے کبھی اس معاملہ کا گہرائی میں اُتر کر مطالعہ کیا ہو۔ وہ قومیں جن کے ہاں ہم معاشی زندگی میں ایک طرح کی آزادی دیکھتے ہیں وہ اگرچہ اُس طرح پا بہ زنجیر تو نہیں ہیں جس طرح کہ روسی اور ان کے زیرِ اقتدار لوگ ہیں لیکن اُن کے ہاں بھی آزادی اب محض نام کی رہ گئی ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ اشتراکی ممالک میں قوت اور طاقت کی مدد سے لوگوں کو معاشی زندگی کے ایسے جیل خانوں میں ڈال دیا جاتا ہے جن کی حد بندیوں کو لوگ بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اور جن کی تاریکیوں سے نکلنے کے ہمیشہ آرزومند رہتے ہیں۔ مگر ان آزاد معیشت کے دعویدار ممالک میں لوگوں کو قید و بند میں ڈالنے کی بجائے نہایت عیاری اور ہوشیاری کے ساتھ ان کے گرد ایسی غیر محسوس دیواریں چُن دی جاتی ہیں، جن میں لوگ مقید تو ضرور رہتے ہیں مگر جن سے باہر نکلنے کی خواہش ان کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو بالکل آزاد اور خود مختار سمجھتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ منصوبہ بندی کا دستِ غیب اُن کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور جس سے نکلنے کی کوئی کوشش بھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتی۔ اشتراکیت کا جبر و تشدد ملک کے باشندوں کو مختلف سانچوں میں ڈھالتا ہے مگر آزاد معیشت میں منصوبہ بندی کا فسوں لوگوں کے فکر و احساس کی صورت گری کرتا ہے۔

قریب قریب یہی حال سیاست کا ہے۔ اب مملکت اور حکومت کا دائرۂ اقتدار اتنا وسیع اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں پر اس قدر محیط ہے کہ مملکت خود ایک مستقل دین بن گئی ہے جو اپنے دائرۂ اثر میں کسی دوسری مؤثر طاقت کے وجود کو برداشت نہیں کرتی۔ آج مملکت اپنے ہر شہری سے یہ چاہتی ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنی جان، مال، اولاد، عزت، آبرو، حتیٰ کہ ضمیر و ایمان تک کو قربان کر دے اور اپنی تمام خواہشوں اور امنگوں کو بھی اس کی مشیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ اس کی دوستی اور دشمنی، اس کی پسند و ناپسند بلکہ اُس کی حیات و ممات بھی ریاست کی خاطر ہو۔ مانگے تو اسی سے مانگے اور جھکے تو اسی کے آگے جھکے۔ جدید مملکت عہد حاضر کا سب سے بڑا معبود ہے۔ آج وہ فرد سے مکمل اور بلا شرکتِ غیرے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہی فرد کو ایک پوری شریعت دیتی ہے جو اس کی زندگی کے تمام جزئیات و فروع کا احاطہ کر لیتی ہے، اور وہی اپنے نظامِ تعلیم اور وسائل نشر و اشاعت کے ذریعہ سے افراد کے لیے عقائد، تصورات، نظریات اور فلسفۂ حیات و ممات متعین کر دیتی ہے۔ یہ نیا رنگ جو موجودہ دور میں ریاست نے اختیار کیا ہے اس کی وجہ سے صرف یہی نہیں کہ اسے انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل ہو گیا ہے، بلکہ درحقیقت عملاً وہ خدا اور دین کی پوری پوری مدِ مقابل بن گئی ہے۔

آج سے دو سو سال قبل اسٹیٹ کی یہ حالت نہ تھی۔ ایک طرف ذرائع رسل و رسائل کی کمی کی وجہ سے اس کی گرفت تمام علاقوں میں یکساں طور پر مضبوط نہ ہوتی تھی۔ وہ صرف اسی بات پر قانع رہتی تھی کہ اس کے زیرِ اقتدار رہنے والے لوگ صرف اسے محصولات ادا کر دیا کریں۔ اور اس کے اقتدار کو کسی طرح چیلنج نہ کیا جائے۔ اس سے بڑھ کر نہ تو اس کا کوئی مطالبہ تھا اور نہ یہ کسی بات کی آرزومند تھی۔ اس کے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی فہرست میں بالعموم تین چیزیں شامل ہوتیں، خارجی دفاع، اندرونی نظم و نسق اور معاہدات و مواثیق کی تعمیل کروانا۔ یہی وجہ ہے کہ جو فسق و فجور، جو برائی اور غرائی، عیش و تنعم کی جو مختلف شکلیں دربار و ایوان میں جنم لیتیں، وہ زیادہ تر وہیں تک، یا حد سے حد تک دار السلطنت کی سوسائٹی

تک محدود رہتیں، ان سے آگے نہ بڑھنے پاتیں۔ سوسائٹی کا عام طبقہ ان برائیوں اور گمراہیوں کے اثرات بد سے بڑی حد تک محفوظ و مامون رہتا۔ ریاست اُس زمانے میں انسانی زندگی کا احاطہ کرنے پر عملاً قادر بھی نہ تھی، اور ایسے ہمہ گیر پروگرام لے کر ریاستیں اس زمانے میں اُٹھتی بھی نہ تھیں۔

دوسرے مملکت اپنے آپ کو اخلاقی پابندیوں سے آزاد نہ سمجھتی تھی۔ مذہب کی حقیقی روح اپنی پوری تازگی اور قوت کے ساتھ نہ سہی، کم از کم ایک کمزور اور معمولی شکل میں اس دور کے سارے افکار و اعمال میں جاری و ساری تھی اور ریاست بھی اس بات پر مجبور تھی کہ اس کی برتری اور بالادستی کو تسلیم کرے۔ چنانچہ وہ لوگ جو بااختیار تھے وہ اپنی ساری بدعنوانیوں اور بے حیائیوں کے باوجود اتنی جرأت نہ رکھتے تھے کہ علانیہ اخلاقی اقدار اور معیارات بدل ڈالیں اور دانستہ اُن برائیوں کی اشاعت کرنے لگیں جنہیں مذہب و اخلاق مذموم قرار دیتے ہیں۔ ان حالات میں اگر مذہب اور سیاست کی تفریق کا کوئی قائل تھا بھی تو اس سے اتنی بڑی قباحت رونما نہ ہو سکتی تھی جتنی آج ہوتی ہے، کیونکہ اس زمانے میں سیاست کا دائرہ اپنے جبروت اور اقتدار کے باوجود ہمہ گیر کی قوت سے محروم تھا۔ اور زندگی کے میدان میں مذہب کے دائرے کے لیے بھی کافی گنجائش باقی رہ جاتی تھی۔ لیکن آج اس عہد میں جس میں ہم نے آنکھیں کھولی ہیں حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ اب مذہب اور سیاست کی تفریق کا فلسفہ یہ معنی رکھتا ہے کہ سب کچھ قیصر کا ہو جائے اور خدا کا کچھ بھی نہ رہے۔ اب سلطنت اپنے اوپر کسی ہستی کی بالاتری نہیں مانتی جس کا کوئی حکم اس کے اختیارات کو محدود کر سکتا ہو، اور اس کے برعکس وہ افراد سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس کی لاشریک بالاتری کو تسلیم کریں اور اپنے آپ کو بالکل اس کی اطاعت میں دے دیں۔ اگر ریاست مناسب سمجھے تو لوگوں کو نجی طور پر مذہب و اخلاق کی پیروی کرنے کی اجازت دے دے، لیکن اوّل تو وہ خود مذہب اور اخلاق سے بالا ہے، دوسرے انسانی زندگی پر اس کی بالاتری اس قدر مکمل ہے کہ نجی زندگی میں مذہب و اخلاق کے دائرے کی وسعت کا انحصار نہ تو مذہبی احکام پر ہے نہ افراد کے شخصی اعتقاد پر، بلکہ وہ سراسر ریاست کی مرضی پر منحصر ہے۔ جتنا وہ چاہے گی اس کو پھیلنے دیگی اور جتنا چاہے گی سکیڑ دیگی۔ یہاں تک کہ اگر وہ چاہے تو انتہائی مذہب پرست آبادی

کے بطن سے سخت مذہب دشمن نسل اٹھا کر دکھا سکتی ہے۔

مملکت کی اس ہمہ گیری اور الوہیت کے دعووں میں، جن کی عملی تعبیر ہم آج کل کی کلیت پسند یا نیم کلیت پسند ریاستوں میں دیکھ رہے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ کوئی طبقہ اپنے مذہب اور دین و ایمان پر قائم رہ سکے، خصوصاً جبکہ اُس کا دین و مذہب عیسائیت یا بودھ مت جیسا مسکین مذہب نہ ہو بلکہ اسلام جیسا کلیت پسند مذہب ہو جو زندگی کے سارے گوشوں پر اسی طرح حاوی ہونے کا تقاضا کرتا ہے جس طرح آج کل کی ریاست کرتی ہے۔ اب تو اعلائے کلمۃ الحق کی واحد صورت یہی ہے کہ ریاست کو اسی حق کا تابع بنایا جائے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اسی حق کو عملاً ریاست بنا دیا جائے جس پر آپ ایمان رکھتے ہیں۔ ورنہ لادینی ریاست میں محض لاؤڈ اسپیکر پر کلمۂ حق بلند کر کے یہ سمجھ لینا کہ ہم اعلائے کلمۃ الحق کر رہے ہیں صرف ایک غلط فہمی ہے جس کی تہ میں حقیقت کا ایک ادنیٰ شائبہ تک نہیں ہے۔

جب تک مسلمان ریاست کے بارے میں اس جدید رجحان اور اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ نہیں لیتے اس وقت تک کوئی ایسا انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا جس میں نظام حیات کے بدلنے کا داعیہ ہو۔ آپ آج چراغ لے کر ڈھونڈ لیجئے اور حیاتِ انسانی کے کسی ایسے خانے کی تلاش و جستجو کیجئے جس پر مملکت کے اثرات پوری طرح نمایاں نہ ہوں۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آپ اس معاملہ میں جتنی سعی و جہد کریں گے اُس میں آپ کو اتنی ہی ناکامی ہوگی۔ اب زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا منقد بھی ایسا نہیں رہا جس میں مملکت کے رجحانات نفوذ نہ کر گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی صورت ہے کہ اس میں زندگی کے ایسے چھوٹے چھوٹے جزیرے قائم نہیں کیے جا سکتے۔ جہاں اطمینان اور سکون کے ساتھ الگ بیٹھ کر پہلے لوگوں کی تربیت کی جائے اور پھر انہیں لا کر باطل کے خلاف ایک دم صف آراء کر دیا جائے۔ فسق و فجور کا وہ طوفان جو حکومت کے چشمہ سے اُبل کر آتا ہے وہ اتنا طاقتور اور خوفناک ہوتا ہے کہ اس کے دائرۂ اثر میں کوئی جزیرہ اس کی لپیٹ سے محفوظ نہیں رہ سکتا، اور نہ ایسے کسی جزیرے کو یہ فاسق و فاجر حکومتیں پنپنے کا موقع دیتی ہیں جس میں ان کو کسی مدِ مقابل طاقت کے ابھرنے کا کچھ بھی امکان

(بقیہ اشارات)

نظر آتا ہو۔

ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ماضی میں بے شمار بندگانِ خدا ایسے گزرے ہیں جو دنیا داری اور مادیت کے پھیل جانے کے بعد دینی رجحان اور خدا طلبی کا مرکز تھے۔ اُن کی حیثیت بحرِ ظلمات میں روشنی کے مینار کی سی تھی جہاں لوگ پروانہ وار گرتے اور نورِ ہدایت حاصل کرتے۔ مگر اس کا کیا علاج کیا جائے کہ آج کل حکومت اپنی لامحدود قوت و طاقت سے شر اور فساد کی جو خطرناک آندھیاں چلاتی ہے، اور گمراہی اور ضلالت کی جو تند و تیز موجیں خدا ناشناسی اور جاہلیت کے سمندروں سے اٹھائی جاتی ہیں وہ اول تو ان میناروں کو ہی مسمار کر دیتی ہیں، اور اگر وہ باقی رہ بھی جائیں تو یہ چند منفرد لائٹ ہاؤس کسی طرح بھی اتنی روشنی نہیں پھینک سکتے جو جدید زمانے کی حکومت کے اٹھائے ہوئے ہمہ گیر طوفانِ ظلمت کا مقابلہ کر سکے۔ اس پر مزید یہ کہ کفر و فسق کی حکومت جہاں بھی کام کر رہی ہے وہاں اس طرح کے انفرادی میناروں کی پیدائش اور ان کے اُبھرنے کے امکانات وہ روز بروز بڑی تیزی کے ساتھ ختم کرتی چلی جا رہی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے بعد ایک ہزار سال کی مدت میں بھی سیاسی نظام کے بگاڑ نے اسلامی تمدن اور اسلامی معاشرت کو وہ نقصان نہیں پہنچایا تھا جتنا کہ گذشتہ سو سال کے اندر غیر اسلامی تسلط نے پہنچا دیا ہے۔ اس زمانہ میں سیاسی نظام نہ اتنا ہمہ گیر تھا، نہ اتنا طاقتور اور مضبوط تھا، اور نہ اس کے پاس ایسے زبردست ذرائع و وسائل تھے کہ جدید زمانے کی ریاست سے اس کو کچھ بھی نسبت ہو۔ اس بنا پر معتقدات و افکار کی دنیا اور اخلاق و تہذیب اور تمدن و معاشرت کے دائرہ تک سیاسی تبدیلیوں اور سلاطین و امراء کی بگڑی ہوئی روش کے اثرات پہنچتے پہنچتے اس قدر کمزور اور ضعیف ہو جاتے تھے کہ ان سے اسلامی اقدار اور طرزِ زندگی کو کوئی بہت بڑا خطرہ لاحق نہ ہو سکتا تھا۔ پھر حکومت کے متوازی دوسری طاقتیں بھی موجود تھیں اور انہیں کام کرنے کے پورے مواقع حاصل تھے۔ آزاد نظامِ تعلیم، آزاد مدارس، آزاد تربیتی ادارے، آزاد نظامِ معاشرت اور آزاد معیشت مل جل کر اتنا کافی زور رکھتے تھے کہ کبھی کوئی بڑی سے بڑی بگڑی ہوئی حکومت بھی پورے نظام کو بگاڑ دینے پر قادر نہ ہو سکتی تھی۔ مگر آج حالت یہ ہے کہ جس آن کوئی برائی اقتدار کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اسی آن وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ معاشرت و معیشت سے لے کر تعلیم و تربیت اور خاندانی زندگی کے نظام تک اس کے زہریلے اثرات پھیل جاتے ہیں۔ پھر زندگی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں رہتا جس پر اس کے نقوش نہایت واضح اور گہرے نہ ہوں۔ ریڈیو، سینما، صحافت، مدارس، یونیورسٹیاں سب پر فسق کا پورا پورا قبضہ ہوتا ہے۔ فاسق ریاست جو عقائد و تخیلات، جو معتقدات و نظریات، جو افکار و احساسات لوگوں میں پھیلانا چاہتی ہے، بغیر کسی جبر و اکراہ اور بلا کسی تشدد کے اپنے وسائلِ نشر و تبلیغ اور تعلیمی پالیسی کے ذریعہ پھیلا دیتی ہے۔ نظری حیثیت سے لوگ اس معاملہ میں آزاد ہوتے ہیں کہ وہ جس دین کو چاہیں اپنا لیں، جس نظریۂ حیات کی پیروی کرنا چاہیں، کریں، جس طرزِ زندگی کو اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، کر لیں، لیکن عملی حیثیت سے یہ آزادی محض حکایتِ تشنہ و سراب ہے۔ اسٹیٹ کی قوتِ قاہرہ عوام پر پوری طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ بالکل دھیمے دھیمے غیر محسوس طور پر بڑی حکمتِ عمل کے ساتھ افراد کو جس سانچے میں چاہتی ہے ڈھالتی چلی جاتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد حالات جس سرعت سے بدل رہے ہیں وہ ہر ہوشمند انسان کو چونکا دینے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن دیکھیے، کیا فسق و فجور کو فروغ دینے میں کسی پر جبر و تشدد کیا گیا ہے۔ اس کی نشر و اشاعت تو کبھی آرٹ اور ادب کے نام پر کبھی دیہاتی فلاح و بہبود کے نام پر کبھی قومی عزت و ناموس کے نام پر کبھی ترقی پسندی اور روشن خیالی کے نام پر نہایت خوبی سے کی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ریڈیو سے لوگوں کا دل بہلا دیا جاتا ہے، کچھ فلموں کو مسنر کرنے میں ذرا سی چشم پوشی سے کام لے لیا جاتا ہے، کچھ مخلوط تعلیم کے ذریعہ سے قوم کی تعلیمی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اور کچھ بڑھتی ہوئی آبادی کے مرض کا مداوا برتھ کنٹرول کے پروپیگنڈا سے کر دیا جاتا ہے۔ اتنی ذرا سی تدبیروں کا نتیجہ یہ ہے کہ اصحاب اقتدار کے فاسقانہ عزائم کی فوج ظفر موج میدان پر میدان فتح کرتی چلی جاتی ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ہر روز وہ کتنے نئے خاندانوں اور افراد کو خراب کر دیتی ہے۔ اس فوج نے ہمارے عائلی نظام کے قلعہ میں رخنے پیدا کیے مگر ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ اور اب جب دشمن پوری طرح اندر گھس آیا ہے تو ہم بھی اتنے بدل چکے ہیں کہ اسے اپنے حق میں فال نیک خیال کر رہے ہیں۔ اس فوج کے مختلف دستے زندگی کے مختلف گوشوں میں پھیل کر اپنا کام پوری تندہی سے کر رہے ہیں اور ہم ایک بے بس اور مجبور انسان کی طرح ان کی ریشہ دوانیوں کا تماشہ دیکھتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے ہماری دینی حس اور حمیت کو اب اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ ہمارے اندر اس کے خلاف نفرت کی کوئی معمولی سی تحریک بھی پیدا نہیں ہوتی۔ آپ اپنی ذات میں خواہ کتنے ہی نیک اور پاکباز ہوں لیکن اس مسموم فضا کو کیا کریں گے جو آپ کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ مدرسہ میں، اخبارات میں، ریڈیو پر غرض ہر جگہ آپ کے کانوں میں وہی باتیں پڑیں گی جن کی ریاست ترویج و اشاعت کرنا چاہتی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ پہلے ایک مدت صرف افراد بنانے میں صرف کرنی چاہیے، پھر ایک اور مدت صرف معاشرے کی اصلاح میں صرف ہونی چاہیے، پھر آخر کار اس انفرادی تیاری اور اجتماعی اصلاح کے نتیجے میں یا تو ریاست آپ سے آپ بدل جائے گی، یا نہیں تو وہ حملہ آور ہو کر ریاست کو بدل ڈالے گا، تو دراصل ایسا شخص اپنے خیالات ہی کی بنائی ہوئی دنیا میں رہتا ہے، واقعات کی دنیا سے اس کو کوئی

تعس نہیں ہے۔ واقعات کی دنیا میں رہنے والا جانتا ہے کہ ہمہ گیر ریاست میں انقلاب ایک جوابی ہمہ گیر تحریک کے بغیر نہیں آسکتا۔ ریاست کے تسلط میں جہاں جتنا رخنہ بھی پایا جائے اس کے اندر فوراً آگے بڑھ کر در آنے کے لیے جو تحریک تیار نہ ہو اور خود ریاست پر تسلط حاصل کرنے کا جو موقع بھی مل جائے اسے استعمال کرنے سے جو تحریک جی چراتی ہو اس کا یہ کہنا کہ ہم نظام زندگی میں انقلاب چاہتے ہیں، یا تو علم کا افلاس ہے یا عقل کا افلاس۔ اس طرح کی باتیں سوچنے والوں کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ جدید ریاست افراد کی تیاری اور معاشرے کی اصلاح کے مواقع کس رفتار سے کم کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اٹھنے والے اگر اس کے تسلط کو گھٹانے اور اس کے خلاف اصلاح طلب قوتوں کو آگے بڑھانے کا کوئی موقع پاتے ہوں اور پھر جان بوجھ کر اس کو اس لیے چھوڑ دیں کہ انہیں پہلے افراد اور معاشرہ تیار کرنا ہے، تو لامحالہ اسے نادانی ہی سمجھا جائے گا۔

مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی میں مملکت اور ریاست کی اہمیت کا احساس کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ یہ تصور ان میں بالکل ابتدا ہی سے پایا جاتا رہا ہے کہ انسانیت کی فلاح اس میں ہے کہ دین و دنیا اور اخلاق و سیاست ساتھ ساتھ رہیں۔ یہی تصور مختلف اوقات میں مختلف تحریکات کی شکل میں ملتِ اسلام میں جلوہ گر ہوا ہے۔ دُور نہ جائیے اور صرف یہ دیکھیے کہ یہ ملک پاکستان کس تخیل کی کرشمہ سازی ہے؟ پاکستان کے مطالبے میں جو چیز مسلمانوں کے لیے وجہ کشش تھی وہ آخر اس کے سوا کیا تھی کہ ان کا دین اُن اجتماعی تخیلات اور معاشرتی افکار کو قبول کرنے میں مانع تھا جن پر ہندوستان کی انگریزی حکومت قائم تھی اور آئندہ کانگریس کی تجویز کردہ سیکولر ریاست قائم ہونے والی تھی۔ مسلمان اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکے تھے کہ بنیادی حقوق کی یقین دہانیاں، اور مذہب و کلچر کی آزادی کے وعدے اس دور کی جمہوری لادینی حکومت میں اس قدر بے معنی ہیں کہ ان کے سہارے اسلامی تہذیب کو ہندوستان میں زندہ نہ رکھا جا سکے گا۔ ریاست کی ہمہ گیری اور اس کی قوت آہستہ آہستہ سب لوگوں پر اپنے مخصوص تصورات پوری طرح مسلط کر دیگی۔ اس کے مقابلے میں یہ امید رکھنا کہ ہم ان اثرات سے

اپنے آپ کو بچا کر رکھ سکیں گے محض واہمہ ہے۔ مسلمانوں کو انگریزی دور کا طویل تجربہ یہ بتا چکا تھا کہ اس زمانے کی ہمہ گیر ریاست زندگی کے کسی شعبہ میں بھی مذہب کو مطلق العنان اور خود مختار نہیں چھوڑتی۔ انہی وجوہ سے جب مسلمانوں کے سامنے ان کی اپنی ایک آزاد مملکت کا تخیل پیش کیا گیا تو انہوں نے لپک کر اسے قبول کر لیا۔ انہوں نے ایک ایسی مملکت کے قیام کو اپنے دین کا تقاضا سمجھا جہاں مملکت اور اس کے وسیع ذرائع و وسائل کو دینِ حق کے قیام پر صرف کیا جائے اور جہاں ریاست مسلمانوں کے تخیلات میں صرف مزاحم ہی نہ ہو، بلکہ اسلامی نظریات و افکار کی توسیع و اشاعت اپنا فرضِ منصبی سمجھے اور اپنے اثر سے ان تمام احکام کو نافذ کرے جن کا حق تعالیٰ ملتِ اسلامیہ سے مطالبہ کرتا ہے۔

مملکت اور ریاست کو حلقہ بگوشِ اسلام بنانے کی ضرورت اب دنیا کے دوسرے مسلم ممالک میں بھی بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو اب پوری طرح احساس ہو چکا ہے کہ اگر وہ کوئی ہمہ گیر انقلاب لانا چاہتے ہیں تو اُن کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ اقتدار کی باگیں فساق و فجار سے چھین کر اُن لوگوں کے ہاتھوں میں دیں جو اس کو خیر اور بھلائی کے لیے استعمال کر سکتے ہوں اور جن سے یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ وہ قوت و طاقت سے اُن برائیوں کو روکیں گے جنہیں اسلام دنیا سے مٹانا چاہتا ہے۔

بعض حلقوں میں یہ اعتراض بھی اٹھایا جاتا ہے کہ مذہب کو مملکتی اقتدار اور دنیوی سربلندی کا ذریعہ نہیں بننا چاہیے۔ اس کا مختصراً جواب یہ ہے کہ اسلامی نظام کے عملیہ کی خواہش اور آرزو دنیوی اقتدار کی ہوس سے بالکل ایک مختلف اور جداگانہ چیز ہے۔ ان دونوں کو ایک چیز ہی سمجھ کر ان پر حکم لگا دینا صحیح نہیں۔ جو لوگ اپنے شخصی یا خاندانی یا قومی اقتدار کے لیے کوشش کرتے ہیں اُن کی نیت بالکل جدا ہوتی ہے اور یہ چیز اسلامی نقطۂ نظر سے بہت بُری ہے۔ یہ وہ جاہلیت ہے جس سے بچنے کے لیے مسلمان کو اپنے اللہ سے ہمیشہ پناہ مانگنی چاہیے۔ لیکن جس اقتدار سے مقصود یہ ہو کہ کفر کا غلبہ مٹے اور

خدا کی زمین میں اس کے دین کا بول بالا ہو اس کو دنیا داری سمجھنا سخت غلطی ہے۔ کوئی دنیوی کام جو جذبۂ دینی کے تحت اسلامی نصب العین کی محبت میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق کیا جائے وہ دینی کام ہی ہوتا ہے۔ اسلام میں دین اور دنیا کے ڈانڈے ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔ یہاں اصل معاملہ نیت اور ارادہ کا ہے۔ ایک کام جو ہمیں بظاہر دنیا داری نظر آتا ہے، خالص دینی کام ہو سکتا ہے اور دوسرا کام جس میں ہم سراسر روحانیت دیکھتے ہوں حقیقۃً دنیا داری بن کر رہ جاتا ہے۔ مسلمان کا ہر دنیوی عمل روحانی عمل ہے بشرطیکہ وہ اسلام کے اخلاقی اقدار و غایات کا تابع ہو۔ اور اُس کا ہر روحانی اور مذہبی کام بھی دنیا داری ہے جس میں مالک کی رضا جوئی شامل نہ ہو۔